# اجتہاد اور اقبالؒ

ڈاکٹر سید عبدالباری

علامہ اقبالؒ نے اپنے انگریزی خطبات میں شامل چھٹے خطبے میں اجتہاد کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ خطبات ۱۹۳۰ میں لاہور سے' پھر مزید ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ ۱۹۳۴ میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس لندن سے شائع ہوئے تھے۔ اس خطبے کا عنوان تھا: The Principle of Movement in the Structure of Islam (اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول)۔ اردو میں اسے نذیر نیازی نے اس بنا پر "الاجتہاد فی الاسلام" کا عنوان دیا کہ علامہ نے اس مطمح نظر کے ساتھ یہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا کہ اسلام جس نظام حیات سے عبارت ہے اس میں یہ پتا چلانا چاہیے کہ کون سا ایسا اصول ہے جو اسے زندہ اور متحرک رکھتا ہے تاکہ تغیر و انقلاب کی اس دنیا میں جہاں زندگی کو ہر لحظہ نئے نئے احوال و شئون سے مطابقت و موافقت کی ضرورت پیش آتی ہے' وہ اصول جوں کا توں برقرار رہے۔ علامہ کے نزدیک یہ اصول ہے: اجتہاد---!

علامہ کے نزدیک اجتہاد سے مقصود ہے زندگی کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالتے رہنا' یعنی کردار کی مسلسل تعمیر و تشکیل یا تبدیلی ذات۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر قوم کی ہستی اور بقا کا راز اس کوشش میں مضمر ہے کہ اس کا ایمان و یقین اس سے جس قسم کی زندگی کا متقضی ہے وہ انفرادی و اجتماعی ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس کے مطابق بدلتی رہے۔

علامہ نے اسلام میں اجتہاد کی معنویت اور ناگزیریت کا نہایت فلسفیانہ اور سائنسی انداز سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے مذکورہ خطبے کے آغاز میں اسلام کے اس امتیاز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس نے دنیاے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے بلکہ اس کے برعکس کائنات کو ایک متحرک وجود قرار دیا۔ یہی تحرک خود اسلام کے طرز فکر اور انسان و کائنات کے بارے میں اس کے تصورات کے اندر بھی موجود ہے۔ علامہ کے نزدیک اسلامی نظام فکر میں فرد کو نمایاں اور مرکزی مقام حاصل ہے اور یہی اجتہاد کا نقطہ آغاز ہے کہ اسے کسی مخصوص طبقے یا گروہ تک محدود نہیں کیا گیا بلکہ کچھ شرائط کے ساتھ ہر

مومن و مسلم کو اس کا اختیار دیا گیا ہے خواہ وہ کسی رنگ، کسی نسل یا کسی مقام سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک رنگ و خون کے رشتے کی اہمیت فرد کی ذاتی قدر و قیمت کو ختم کر دیتی ہے اور یہ آدمی کو زمین سے پیوستگی اور قید مقامی تک محدود کر دیتی ہے۔ یعنی فرد کا بنی نوع انسان اور خدا کی پوری کائنات سے رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اجتہاد کے لیے نوع انسانی کی اپنے مزاج، افتاد طبع اور فطرت کے اعتبار سے یک رنگی میں یقین ضروری ہے۔

علامہ کے عہد میں قوم پرستی اور زمین سے غیر معمولی محبت اور علاقائی پندار کا بڑا زور و شور تھا۔ مغرب نے خلق خدا کو اس طلسم کا اسیر بنایا تھا کہ عقیدہ و اقدار کی یک رنگی بے معنی ہے اور انسانوں کو جوڑنے والا حقیقی رشتہ وطنیت کا رشتہ ہے۔ سرعام یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ قومیں اوطان [وطن] سے بنتی ہیں۔ علامہ نے زمین سے استخلاص [نجات] کی آواز اس مومنانہ بصیرت کی بنا پر بلند کی جو انھیں قرآن حکیم سے گہرے تعلق اور رسول اکرمؐ سے شیفتگی کی بنا پر حاصل ہوئی تھی۔

علامہ، اسلامی نظام فکر میں سب سے زیادہ زور توحید پر دیتے ہیں جو انسانوں کو ملوک و سلاطین کے بجائے اللہ کی اطاعت کرنے اور اتحاد عالم اور وحدت بنی نوع انسان کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی توانائی عطا کرتی ہے۔ علامہ کے زمانے میں جمہوریت کا دور دورہ تھا اور شہنشاہیت کے خلاف ہر طرف صدائے بغاوت بلند ہو رہی تھی۔ بدقسمتی سے اس وقت اسلامی ممالک کے اہل فکر و نظر مغرب کے نظریات کے دام میں اسیر تھے۔ اسلام کے اصول ریاست اور نظام قانون کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اسلام میں آزادانہ غور و فکر کی کوئی گنجایش نہیں۔ علما کا ایک طبقہ اگر ایک طرف جہاد کو منسوخ کر چکا تھا تو دوسری طرف یہ لوگ اجتہاد کے دروازے بند کر کے اس کی پہرہ داری اس طرح کر رہے تھے کہ کوئی اسے کھول نہ سکے۔ علامہ کے نزدیک اسلام میں ثبات اور تغیر دونوں کو مناسب مقام حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ایک ایسے نظام زندگی میں جو انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے، یہ خصوصیت ہونا لازمی ہے۔ گو ثبات و تغیر دونوں کے درمیان توازن ایک مشکل امر ہے۔

علامہ کے نزدیک اسلام، انسان کی حیات اجتماعی میں نظم و انضباط کے کچھ دوامی اصول رکھتا ہے تاکہ اس مسلسل تغیر پذیر دنیا میں وہ اپنا قدم مضبوطی سے جما سکے۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے تغیر و تبدل کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ علامہ کے سامنے مغرب کے اندر مسلسل تغیر و تبدل اور باہم متصادم فلسفوں اور نظریوں کی کشاکش اور اس کے درمیان حیات انسانی کی کس مپرسی اور انسان کی تمدنی و معاشرتی زندگی کے شیرازے کی پراگندگی کا منظر تھا۔ دوسری طرف عالم اسلام کے پچھلے پانچ سو سال بھی ذہنی جمود کے تھے۔ وہ شکوہ سنج تھے ۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت، نہ نگاہ!

---

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

علامہ کے نزدیک ثبات و تغیر میں توازن کو اگر اسلام میں کسی اصطلاح سے اجاگر کیا جا سکتا ہے تو وہ اجتہاد ہے۔ جس کے لغوی معنی تو ہیں کوشش کرنا، لیکن اصطلاحی مفہوم ہے کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش۔ اس سلسلے میں علامہ اس مشہور حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جو اجتہاد کی حدود و قیود کو متعین کرنے کے سلسلے میں حرف آخر ہے۔

اس کے راوی حضرت معاذؓ بن جبل ہیں جنھیں یمن کا عامل مقرر کرتے وقت حضورؐ نے پوچھا تھا کہ وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کس طرح کریں گے، اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ پہلے قرآن اور سنت رسولؐ سے ہدایت حاصل کروں گا اور یہ دونوں ناکافی ہوں تو خود کوئی رائے قائم کروں گا۔ پھر علامہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ گو اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن جب مذاہب اربعہ قائم ہو گئے تو عملاً اجتہاد کی اجازت کبھی نہیں دی گئی، یا اجتہاد کے لیے ایسی شرطیں لگائی گئیں جن کا پورا کرنا سرے سے محال ہے۔ پھر علامہ اپنے اس تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ روش اس نظام قانون نے اختیار کی جس کی بنیادیں قرآن مجید پر استوار ہیں اور جو زندگی کو متحرک و متغیر قرار دیتا ہے۔ قانون اسلام کو سرتاسر جامد بنانے کی اس روش کے پیچھے جو محرکات تھے، علامہ نے ان کا تجزیہ کیا ہے اور تین تاریخی اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

علامہ نے عباسی عہد میں الہیات اسلامیہ کی گرماگرمی اور بحث و نزاع کے اس طویل سلسلے کا ذکر کیا ہے جس نے علماے امت کو دو مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، یعنی عقیدہ خلق قرآن۔ عقلیت پرستوں کی آزاد خیالی تشویش ناک تھی، قدیم طرز فکر کے علما نے اس انداز فکر کو اسلام اور ملت کے لیے موجب انتشار تصور کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دانست میں اسلام کے وجود اجتماعی کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ شرعی قوانین کے اندر سختی پیدا کی جائے۔ پھر اس زمانے میں رہبانی تصوف کے نشوونما نے بھی آزادانہ غور و فکر کے خلاف ردعمل پیدا کیا۔ متصوفین نے فقہاے متقدمین کی لفظی حیلہ تراشیوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تھا۔ اس عہد میں تصوف بھی آزاد خیالی ہی کی ایک شاخ تھا اور عقلیت کا حلیف بن کر سامنے آیا تھا۔ ظن و قیاس کی دنیا کی سیر میں لوگ محو ہو گئے اور ریاست، تمدن اور شریعت کے امور سے ان کا تعلق کمزور ہو گیا۔ علامہ نے اس عہد میں اس اندوہناک صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ تصوف میں گم ہو گئے اور حکومت کی باگ ڈور متوسط درجے کے افراد یا بے علم عوام کے

ہاتھوں میں آ گئی۔ چنانچہ ان کو مذاہب فقہ کی اندھی تقلید کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ پھر اس عہد یعنی تیرھویں صدی کے وسط میں بغداد تباہ و برباد ہو گیا' چنانچہ سیاسی زوال و انحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکرین نے اپنی ساری کوششیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ مسلمانوں کی حیات ملی یک رنگ ہو جائے تاکہ مزید انتشار پیدا نہ ہو۔ اس غرض سے انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ فقہاے متقدمین نے قوانین شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی' اس کو جوں کا توں برقرار رکھیں۔ لیکن بہ قول علامہ' نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کے نتیجے میں افراد کی ذاتی خوبیاں اور صلاحیتیں معدوم ہوتی گئیں اور وہ تقلید کے عادی اور لکیر کے فقیر ہو گئے۔

معاشرے کی تنظیم اگر فرد کی ہستی کو معدوم بنا دے تو یہ کوئی اچھی علامت نہیں اور یہیں علامہ کے دل میں اجتہاد کی قدر و قیمت اور فضیلت کا احساس بڑھ جاتا ہے جو فرد کو غور و فکر اور محنت و کاوش کا پیغام دیتا ہے اور اسے اپنی خودی کی گہرائیوں میں ڈوب کر زندگی کی تزئین کے لیے گہرہاے آبدار منظر عام پر لانے کا ولولہ عطا کرتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ماضی کے غلط اور ضرورت سے زیادہ احترام اور تعظیم کا جو رجحان تیرھویں صدی میں سامنے آیا' روح اسلام کے منافی ہے۔ اس صورت حال پر اقبال' ابن تیمیہ کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے مذہب ظاہری کے موسس ابن حزم سے ہم آواز ہو کر اجماع اور قیاس کے سلسلے میں بڑی چونکا دینے والی باتیں کیں۔ اس عہد کے اخلاقی و فکری تنزل' ضعف اور فرسودگی کے بالمقابل ان کے خیالات قابل قدر ہیں۔ علامہ نے علامہ سیوطی کے آزادی اجتہاد کے دعوے کا بھی اس خطبے میں ذکر کیا ہے۔ پھر وہ اٹھارویں صدی کے مصلح اعظم محمد بن عبدالوہاب نجدی کا بڑے والہانہ انداز سے ذکر کرتے ہیں کہ ان کی تحریک کے اندر آزادی اجتہاد کی روح کام کر رہی تھی' اگرچہ داخلی طور پر اس تحریک کا مزاج قدامت پسندانہ تھا۔ انھوں نے احادیث کے احترام و فضیلت کو قائم رکھا اور امور قانون میں اس پر مکمل انحصار کیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں عالم اسلام میں ترکی سب سے زیادہ مغربی تہذیب اور مغرب کی عقلیت کی تحریک سے متاثر تھا۔ یہ عقلیت پرستی' مغرب سے ذہنی مرعوبیت اور انجام کار مغرب کی اندھی تقلید میں تبدیل ہو گئی۔ ابتدائی ایام میں جب کہ مصطفی کمال کو کلی طور اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا' علامہ کو ترکی کی عقلیت کی تحریک سے کچھ خیر کی امید وابستہ تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "اگر اسلام کی نشات ثانیہ عزیز ہے' جیسا کہ میرے نزدیک قطعی طور پر ہے' تو ہمیں بھی ترکوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور مذہبی ورثے کی قدر و قیمت کا جائزہ لینا پڑے گا۔ علامہ کا خیال تھا کہ آزاد خیالی کی اس تحریک کو' جو عالم اسلام میں تیزی سے پھیل رہی ہے' یوں روکنے کی کوشش کریں کہ قدیم نقطہ نظر کے ماتحت اس کی صحت مند تنقید ہوتی رہے۔ علامہ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور آگے چل کر جب ترکی جدیدیت و عقلیت کے راستے

پر از خود رفتہ ہو کر آگے بڑھنے لگا تو عالم اسلام کے ممتاز مفکرین نے اس کی سختی سے گرفت کی۔ برعظیم میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اسمائے گرامی اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علامہ نے جس وقت یہ خطبہ ارشاد فرمایا' اس زمانے میں تحریک تحفظ خلافت' عالم اسلام اور خاص طور پر برعظیم میں نقطہ عروج پر تھی۔ خلافت' ملوکیت' جمہوریت اور شورائیت کے بارے میں لوگ اسلام کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ جدید دنیا میں ایک جدید ریاست کے قیام اور نظم مملکت کو چلانے کی اسلام کے اندر اہلیت ہے یا نہیں؟ حریت' مساوات اور حفظ نوع انسانی کے سلسلے میں اسلام کے طرز فکر پر سوالیہ نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔ علامہ کا موقف تھا کہ: "ازروے اسلام' ریاست کا مطلب ہو گا کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ اسی لیے اسلامی ریاست کو حکومت الٰہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں متعدد مفکرین نے اسلامی ریاست کے خدوخال پر روشنی ڈالی اور حکومت الٰہیہ کی اصطلاح ایک معروف و مقبول اصطلاح بن کر سامنے آئی۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس حکومت میں انسان کے روحانی تقاضوں کو فوقیت ہو گی یا طبیعی' مادی اور دنیوی مسائل تک یہ محدود ہو گی۔ اقبال کے مطابق' اسلام نے جدید فکر بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مذہب کی جو سب سے بڑی خدمت انجام دی' وہ اس کی مادہ پرستی پر تنقید ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ مادی کے بحیثیت مادی کوئی معنی ہی نہیں اِلاّ یہ کہ ہم اس کی جڑیں روحانی میں تلاش کریں۔ بالفاظ دیگر یہاں کسی ناپاک دنیا کا وجود نہیں' لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے ریاست کے معنی ہوں گے کہ ہماری یہ کوشش کہ جسے ہم روحانی کہتے ہیں اس کا حصول اپنی ہیئت اجتماعیہ میں کریں۔

اقبالؒ نے اپنے خطبے میں ترک وطن پرستوں کی ان کوششوں پر تنقید کی جس کے تحت انھوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کے مغربی نقطہ نظر کو اختیار کر لیا۔ اس نظریے کو اقبالؒ نے غلط اور گمراہ کن قرار دیا۔ اس سلسلے میں اقبال نے وطن پرستی کے نظریے پر بھی سخت تنقید کی ہے بلکہ انھوں نے ایک صاحب بصیرت اہل قلم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: تہذیب جدید کو' جس کی بنا وطنی انانیت پر ہے' انسان کے دور وحشت و بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہیے۔

اقبالؒ اسلامی طرز حکمرانی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے اور منصب خلافت اب کسی فرد واحد کا حق نہیں بلکہ اس منصب کو کسی منتخب مجلس یا افراد کی ایک جماعت کے ذمے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ایک بین الاقوامی نصب العین کی طرف ہمارا ذہن متحرک ہو سکے گا۔ اس خطبے کے ایک حصے میں علامہ' ترکی کے اس عہد کے مقبول شاعر ضیا گوکلپ کے بعض متجددانہ

خیالات پر تنقید کرتے ہیں اور اس کی لغزشوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً ترکی زبان میں نماز' تلاوت قرآن اور عورت کو وراثت میں مرد کے مساوی حق وغیرہ۔ علامہ کو اس وقت ترکوں سے حسن ظن تھا کہ وہ ذہنی بیداری کی دولت حاصل کر چکے ہیں اور خیالی دنیا سے نکل کر عالم حقیقت میں آ گئے ہیں۔ لیکن مغرب کے اثرات نے ترکوں میں تخلیقی صلاحیت کو پنپنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کی ذہنی بیداری کا ترکی مرکز نہ بن سکا اور اسلامی نشات ثانیہ کی شعاعیں حسن البناءؒ اور سید قطبؒ کے مصر' ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور اقبالؒ کے برعظیم اور آیت اللہ خمینی کے ایران سے پھوٹیں اور اعلیٰ درجے کا انقلاب آفریں سرمایہ فکر و خیال منظرعام پر آیا۔

اس خطبے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی یہ شدید آرزو تھی کہ اسلامی قانون کی نشوونما جو صدیوں سے رکی ہوئی ہے' جاری ہو مگر اس کے لیے جو محنت اور کاوش درکار ہے اس کا بھی انھیں احساس ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر مسئلے میں اس روح کو برقرار رکھا جائے جس کا اظہار سیدنا عمر فاروقؓ کی ذات سے ہوا' جو ہر معاملے میں آزادی رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے۔ علامہ' اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ حریت اور آزادی کے نام پر جو تحریک عالم اسلام میں چل رہی ہے وہ تفرقہ و انتشار کی موجب بھی ہو سکتی ہے اور نسلیت و قومیت کے جن تصورات کو اس تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھایا جا رہا ہے' وہ ایک وسیع مطمع نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے۔

علامہ' اس موضوع پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں کہ کیا اسلامی قانون کی از سر نو تعمیر فی الواقع ممکن ہے؟ وہ اس سلسلے میں ایک مغربی مستشرق ہارٹن کی رائے نقل کرتے ہیں کہ: اسلام کی روح بڑی وسیع ہے' اتنی وسیع کہ اس کی کوئی حدود نہیں۔ لادین افکار سے قطع نظر کر لی جائے تو اس نے گرد و پیش کی اقوام کے ہر اس فکر کو جذب کر لیا ہے جو اس قابل تھا کہ اسے جذب کر لیا جائے۔ پھر اسے اپنے مخصوص انداز میں نشوونما دیا۔ چنانچہ علامہ' پورے اعتماد سے اعلان کرتے ہیں کہ جونہی فقہ اسلامی کا مطالعہ غائر نگاہوں سے کیا جائے گا اس کے متعلق اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد ہے یا مزید نشوونما کے قابل نہیں رہا۔ اسلامی قانون کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ قرآن مجید کے اس مطمع نظر پر روشنی ڈالتے ہیں جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا ہے اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمع نظر ایسا ہو گا' اس کی روشنی ارتقا کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر علامہ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں' اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔ وہ ماضی کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے قطع نظر نہیں کر سکتی۔ اس کے مصلحین کی ذمہ داری نہایت نازک اور سنگین ہے۔ انھیں اتحاد انسانی

کے نقطہ نظر سے اپنے ضابطہ حیات کو پیش کرتا ہے تاکہ باہم دگر حریف نسلیں اول دولت ایمان سے مالا مال ہوں۔ پھر اس متفرق مجموعے کو ایک ایسی امت میں بدل دیا جائے جس کا ایک شعور ذات ہو۔

علامہ اقبالؒ نہایت فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اور سیاست اسلام نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ ہمارے فقہا کی قانونی ذہانت و فطانت کا مرہون منت ہے۔ اس کا اعتراف فان کریمرنے بھی کیا ہے کہ رومیوں کے بعد عرب ہی وہ قوم تھی جس کے پاس بڑی خوبی اور محنت سے تیار کیا ہوا ایک نظام قانون موجود ہے۔ اقبال کا یہ کہنا تھا کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔ آج آزادانہ غور و فکر اور جدید مسائل میں علما کی اجتہادی کاوشوں سے ان کا یہ تصور حقیقت کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ پھر علامہ نے اسلام کے قانون وراثت کو جو قرآن میں بیان ہوا ہے' نہایت سائنسی اور انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ پھر وہ حدیث اور اجماع و قیاس کے مصالح اور متقضیات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مسئلہ اجتہاد میں احادیث کی سرتاسر قانونی حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ علامہ' شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں جس سے قانون سازی کے معاملے میں حدیث کی ہر زمانے اور ہر دور میں حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ وہ امام ابوحنیفہؒ کے اصول استحسان یعنی فقہی ترجیح کے اصول کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں' بہ احتیاط مطالعہ کریں۔ پھر وہ ایک نہایت جامع اور فکر انگیز بات کہتے ہیں:

> سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی انجام دی ہے کہ انھوں نے مجرد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کے بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا۔ لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرتؐ نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہوگی جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں۔ پھر یہ ان اصولوں کی حیاتی قدر و قیمت کا پورا پورا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنی فقہ کے بنیادی ماخذ کی از سر نو تعبیر و ترجمانی کر سکتے ہیں۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' علامہ اقبال' ص ۲۶۷)

علامہ اقبالؒ اسلام کے قانونی تصورات میں اجماع کو سب سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں لیکن انھیں افسوس ہے کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس لیے کہ یہ مطلق العنان ملوکیت کے مفادؔ کے خلاف تھا کہ وہ اجماع کو ایک مستقل تشریعی ادارے کی حیثیت دیتے۔

اموی اور عباسی خلفا کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین ہی کے ہاتھ میں رہے اور اس کے لیے کوئی مستقل مجلس قائم نہ ہو۔ اب بیسویں صدی میں اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہوا ہے اور بلاد اسلامی میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا قیام اسی جانب ایک قدم ہے۔ اس ضمن میں وہ مغربی نقادوں کی اس دراندازی کا ازالہ کرتے ہیں کہ اجماع خود قرآن مجید کا ناسخ ہو سکتا ہے اور یہ وضاحت کرتے ہیں کہ اجماع صحابہؓ سے بھی صرف کسی حکم قرآن کی تجدید یا توسیع مقصود تھی۔ کسی کو قرآنی حکم یا نصوص کے سلسلے میں تنسیخ کا حق کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مملکت میں مجالس قانون ساز میں علما کو ایک موثر جزو کی حیثیت سے شامل کرنے کی علامہ حمایت کرتے ہیں لیکن یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ: "شریعت اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدباب ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ بہ حالت موجودہ' بلاد اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی بہ احتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے"۔ (ایضاً' ص ۲۷۲)

علامہ نے قیاس (قانون سازی میں مماثلتوں کی بنا پر استدلال سے کام لینا) پر گفتگو کی ہے اور اس امر میں آریائی اور سامی ذہن کے فرق کو جن میں ایک مجرد پر اور دوسرا محسوس پر زور دیتا ہے' واضح کرتے ہوئے فقہاے حجاز کی اس کاوش کا اعتراف کیا ہے جو عراقی فقہا کی موشگافیوں اور ان کے اس رجحان کے خلاف کہ معاملات کا محض ایک فرضی اور قیاسی سلسلہ قائم کیا جائے' شدت کے ساتھ احتجاج کی شکل میں سامنے آیا اور جس کی بدولت شریعت اسلامیہ ایک جسد بے روح نہ بن سکی۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے اصول قیاس پر بطور ایک ماخذ قانون جو تنقید کی اس کو بالغ نظری کا ایک نمونہ قرار دیتے ہوئے علامہ رقم طراز ہیں: "مذہب حنفی کے خلاف ان کی یہی تنقید تھی جس نے محسوس کو مجرد کے چنگل سے آزادی دلائی اور جس کی بدولت اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اصول فقہ کی تعبیر و ترجمانی میں زندگی کے حقیقی تنوع اور حرکت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ مذہب حنفی نے ان تنقیدوں سے فائدہ اٹھایا اور اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لی کہ جیسے حالات ہوں اپنی قوت تخلیق سے کام لیتے ہوئے' ان سے مطابقت پیدا کی جائے"۔ البتہ اب حنفی فقہا کے اندر یہ روح مفقود ہے۔ وہ اسلاف کی تعبیرات کو کچھ ایسی دوامی حیثیت دیتے ہیں جیسے شروع شروع میں امام موصوف کے ناقدین نے ان فیصلوں کو دی جو انھوں نے واقعات کو دیکھتے ہوئے کیے تھے۔ آخر میں علامہ اس خیال کو کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے' ایک افسانہ قرار دیتے ہیں جو فقط اس لیے پیدا ہوا کہ اسلامی افکار' فقہ کی ایک معین صورت اختیار کرتے چلے گئے اور کچھ اس ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ علامہ اس

موقع پر دسویں صدی ہجری کے مفکر سرخسی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

> فقہائے متاخرین کو (متقدمین کے مقابلے میں) اجتہاد کے لیے زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ قرآن مجید اور سنت رسولؐ میں تفاسیر و شروح کا ذخیرہ اس حد تک وسیع ہو چکا ہے کہ آج کل کے مجتہدین کے پاس، بہ نسبت سابق، تعبیر و ترجمانی کے کہیں زیادہ سامان موجود ہے (ایضاً، ص ۱۷۵)۔

مگر علامہ اس امر میں یہ تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانے کے احوال و ظروف سے فقہ اسلامی کے اندر مطابقت پیدا کرنے کا نام نہیں۔ علامہ بڑے تاسف سے بین الاقوامی سطح پر جو صورت حال ہے اور یورپ نے جس طرح بنی نوع انسان کو گمراہ کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "جس حق و صداقت کا انکشاف عقل محض کی وساطت سے ہو، اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی و تنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا ہے"۔

علامہ کے نزدیک یورپ کے عینی فلسفے زندگی کا موثر جزو نہ بن سکے اور اپنی تمام فلسفہ آرائیوں کے باوجود یورپ کی حالت یہ ہے کہ اس کی فساد زدہ خودی باہم دگر جمہوریتوں کی شکل میں، جس کا مقصد وحید ہی یہ ہے کہ دولت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینے، اپنے تقاضے پورے کر رہی ہے۔ انسان کے اخلاقی ارتقا میں یورپ سے زیادہ کوئی اور بڑی رکاوٹ نہیں۔ نسل انسانی کے روحانی استخلاص [ نجات ] کے مداوے اور کائنات کی روحانی تعبیر کے لیے مسلمانوں کو سامنے آنا چاہیے۔ اس کے لیے اجتہاد کو جملہ شرائط اور قیود کے ساتھ روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔

بعض متجددین اجتہاد کے ڈانڈے آزادی افکار سے ملاتے ہیں۔ اقبالؒ مغرب کے آزادی افکار کے دعوے پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں۔ وہ اس مطلق آزادی کو خطرناک سمجھتے ہیں اور اسے ابلیس کی ایجاد قرار دیتے ہیں ۔

جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد ‌ ‌ ‌ اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ ‌ ‌ ‌ آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

بیسویں صدی میں اس حریت فکر کا بڑا چرچا ہے۔ اس کے نتیجے میں نام نہاد مجتہدین کی ایک بڑی جماعت سامنے آئی جس نے اسلام کو بازیچہ اطفال بنا کر رکھ دیا۔ یہ حضرات اجتہاد کی اصطلاح سے کھلونے کی طرح کھیلنے لگے۔ لوگ بڑی معصومیت سے جمود فکر اور تقلید جامد کے خلاف آزادی فکر کی دہائی دینے لگے۔ علامہ اس طرح کے لوگوں سے خبردار کرتے ہیں۔ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ان متجددین پر علامہ کا تبصرہ ملاحظہ ہو ۔

ہے کس کی یہ جرات کہ مسلمان کو ٹوکے
حریت افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچہ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

علامہ آزادی فکر کے خوف ناک نتائج سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے بے لگام تجدد کی شدت سے مذمت کی۔ وہ فکر و تدبر کا سلیقہ پیدا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اقبالؒ ہندی مسلمانوں کے زوال تحقیق اور ذوق تقلید پر بھی نالاں ہیں جو ان کے نزدیک محکومی و غلامی کا نتیجہ ہے۔ اپنی نظم اجتہاد میں وہ ایک طرف افکار عمیق کی نایابی اور حکمت دین سے محرومی پر ماتم کناں ہیں۔ دوسری جانب ان گم کردہ راہ مفکرین پر بھی تاسف ظاہر کرتے ہیں جو مغرب کی غلامی کے نتیجے میں اسلامی عقائد اور نظریات کی غلط تاویلات کرتے ہیں اور اسلام کی صورت مسخ کرنا، روشن خیالی کی دلیل سمجھتے ہیں۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقہ شوق میں وہ جرات اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبالؒ ایک ایسے مرد ہوش مند کا تصور کرتے ہیں جو اگرچہ تقلید کے آغوش میں پرورش پاتا ہے لیکن اس کی فطرت سے تخلیق ابلتی ہے اور جو اپنی سادگی کلام کے باوجود یعنی منطق و لغت کی پیچیدگیوں سے محفوظ رہتے ہوئے، دقیق معانی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اقبالؒ چاہتے تھے کہ فکر اسلامی عصر حاضر کے چیلنج کا سامنا کرنے کی کوشش کرے اور کہنہ پیکر میں روح تازہ جلوہ گر ہو۔

دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب

اقبالؒ ایک ایسے صاف نظر اور روشن ضمیر مہدی برحق کے آرزومند ہیں جو تمام گمراہ کن فلسفوں کے بخیے ادھیڑ دے اور فکر اسلامی کو پھر سے عالم گیر مقبولیت کی منزل تک لا کھڑا کرے۔

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار

علامہ اقبالؒ مشرق و مغرب کا تقابل جگہ جگہ کرتے ہیں اور دونوں کی محرومی و کوتاہی کو واشگاف کرتے ہیں۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

---

پیارے پیارے بچو! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں
آپ کے محبوب رسالے
پیغام ڈائجسٹ
سالنامہ نومبر ۹۸
شائع ہو چکا ہے
☆ نامور ادیبوں کی خوبصورت کہانیوں کا گلدستہ
☆ تایا الٹی میٹم گئے جاپان۔ ٹلو میاں نے چور پکڑا
☆ Y2K ایک عجوبہ۔ کمپیوٹروں کی موت کا سال ...... ۲۰۰۰ء
☆ سلسلے وار ناول جانباز عروج کی جانب گامزن
☆ پی آئی اے پلانیٹیریم ...... زمین پر بیٹھے بیٹھے خلا کی سیر کروانے والا ادارہ
ہمیشہ یاد رکھا جانے والا ...... یادگار سالنامہ
سالنامے میں ہے آپ کے لیے خصوصی انعامی کوپن۔
یہ کوپن بھر کر بھیجئے اور بیش قیمت انعامات حاصل کیجئے
ملنے کا پتا: پیغام ڈائجسٹ، 5-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ فون 7587916